مرتبہ پرکاش پنڈت

اردو کی بہترین رومانی نظمیں

اُردو کی بہترین رُومانی نظمیں

بہترین نظمیں ــــ اس پر اختر شیرانی، فیض احمد فیض،
احمد ندیم قاسمی ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، قتیل شفائی،
اختر الایمان، جاں نثار اختر وغیرہ اُردو کے مشہور و مقبول
شاعروں کی بہترین رومانی نظمیں ــــ اس مجموعہ کے بہترین
ہونے کی ایک اور سند ہے مستند مرتب پرکاش پنڈت کا نام۔
آپ نے ان شاعروں کو مشاعروں میں سنا ہوگا۔ اب اس مجموعہ
کے ذریعے گھر بیٹھے مشاعروں کا لطف اُٹھائیے

بکس

پرائیویٹ لمیٹڈ
جی - ٹی روڈ
شاہدرہ دہلی ۳۲

(سودلیتھو پریس دہلی)

اُردو کی بہترین رومانی نظمیں

مرتبہ:- پرکاش پنڈت

URDU KI BEHTRIN
ROMANI NAZMEN . POETRY
EDITED BY PRAKASH PANDIT

قیمت ایک روپیہ

ترتیب

اختر شیرانی

برباد نہ کر

اے عشق ہمیں برباد نہ کر، ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم تو نہیں یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یہ ظلم نہ کر بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہارِ صبح گئی آنکھوں سے فروغِ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

وہ راز ہے یہ غم، آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں، آجائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا دل کو یہاں، بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

دُنیا کا تماشا دیکھ لیا، غمگین سی ہے بیتاب سی ہے
امید یہاں اک وہم سی ہے، تسکین یہاں اک خواب سی ہے
دُنیا میں خوشی کا نام نہیں، دُنیا میں خوشی نایاب سی ہے
دُنیا میں خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

●

آج کی رات

کتنی شاداب ہے دُنیا کی فضا آج کی رات
کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات
کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

آج کیا بات ہے دُنیا کے نظارے خوش ہیں
باغ کے پھول، سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں
ایک میں نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

دل کی رگ رگ میں ہے، بیتاب محبت اس کی
آنکھ کے پردے پہ لہراتی ہے صورت اس کی
خلوتِ روح میں آباد ہے الفت اس کی
میرے جذبات پہ طاری ہے لطافت اس کی
اور کچھ یاد نہیں اس کے سوا آج کی رات

اے دلِ ایسا نہ ہو کچھ بات بنائے نہ بنے
حالِ دل جو بھی سنانا ہے سنائے نہ بنے
پاس آئیں تو مگر پاس بٹھائے نہ بنے
شرم کے مارے انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہ تصور سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!

میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریٔ عشرت کا جنوں طاری تھا

ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
بسترِ مخمل و کمخواب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

کیا سنو گی میری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگر دوز، میرا نالۂ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو تم میری قربت سے ڈرو
اپنی جرات کی قسم اب میری جرات سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو، میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں وفادار نہیں

اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!

فیض احمد فیض

پہلی سی محبت

مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ!

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے

پیپ بہتی ہوئی، گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبّت میری محبوب نہ مانگ!

●

حسن واپس پھیر دے

میری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو !

ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
تیرے جلووں سے بزمِ زندگی جنت بداماں ہے
میری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بیرنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک
تری بے مہریوں پہ جان دے گی آخرش کب تک
تیری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
میرے دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں
تیری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی

پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذت نہ پائیں گے
گلو میں تیری الفت کے ترانے سوکھ جائیں گے

مبادا یادہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موج ہائے غم میں کھو جائیں
میرے دل کی تہوں سے تیری صورت بہہ جائے
حریم عشق کی شمع درخشاں بجھ کے رہ جائے

مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
میری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

احمد ندیم قاسمی

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ جھانکا کس نے
نیند کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھامے
کس نے پائل کی مدھر لے پہ دوہے گائے

سونی سونی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جن کی جھنکار
مرمریں گالوں پہ روشن ہیں شفق رنگ دیے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام
جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تفکر جیسے
سیلی لہروں میں نظر آتی ہے گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے

وہی عنواں ہیں کمانوں سی بھوؤں میں مستور
مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

انگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی
مسکراہٹ میں گجر دم کی خنک رعنائی
کالے بالوں میں وہ موہوم سنہری لہریں
جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا
وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے پتلے سائے
وادیٔ خواب میں وہ سرسر دنیائے شعور
جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آ جائے

دھجیاں بن کے اڑا رات کا پیراہن تار
تارے ٹکرائے خلاؤں میں فضا چکرائی
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لئے صبح کی دیوی آئی

●

میری شکست

مجھے تسلسلِ لیل و نہار کی سوگند

بجھا نہیں ہے سرِ راہِ انتظار چراغ

گلوں میں لپٹی ہوئی یادِ یار کی سوگند
کھلا ہوا ہے ابھی تک میری شکست کا باغ

میں تیرے جسم کی حدت ابھی نہیں بھولا
اسی کی آگ میرے شعلۂ حیات میں ہے
میں اپنے شوق کی شدت ابھی نہیں بھولا
وہ کیفیت تو عیاں میری بات بات میں ہے

میرا غرور تیرے حسن کی ثبات میں ہے
تو میرے دل میں نہیں ساری کائنات میں ہے
تو دن کی طرح نہاں اس اندھیری رات میں ہے
میں تیرے ذوق کی شدت ابھی نہیں بھولا

تیرے لبوں کی نمی اور تیری نظر کی کرن
میرے شعور میں تحلیل ہو کے پھول بنی
یہ رات، جس کی جبیں پر ہے تیرگی کی شکن
میرے لئے تو تیرے گیسوؤں کا طول بنی

میری شکست، میری فتح کا رسول بنی
میری شکست، میرے راستے کی دھول بنی

میری شکست، تو ادراک کا اصول بنی
کلی کا خون ہوا اور سنور گیا ہے چمن

فطرت

کوہساروں کا یہ گاتا ہوا شاداب سکوت !
یہ ہواؤں میں لرزتا ہوا رنگین خمار
یہ صنوبر کے درختوں کی بلندی کا وقار
بج رہا ہے میرے محبوب میرے دل کا تار
تیری آنکھوں میں ہے امنگوں کی شفق لرزاں !
جھانکتی ہے تیری زلفوں کے دریچوں
جیسے مخمور گھٹاؤں سے ستاروں کی
تیرے ہونٹوں کی لکیریں ہیں کہ یاقوت
تیرے اعضا میں جوانی کے کنول ہیں روشن !
تیرے اعصاب میں، سیماب کی لہریں ہیں رواں
دیوتاؤں کا تخیل ہے تیرا جسم جوال
یا کسی شعر کے سانچے میں جوانی کی فغاں
دو اہم جز ہیں فطرت کی ضرورت کے ہم !

آ کہ فطرت کی مناجات کو سماعت کر لیں
مل کے لہروں کی طرح رقصِ محبت کر لیں
لب سے لب جوڑ کے تھوڑی سی عبادت کر لیں

اختر الایمان

اجنبی

تو ہے کچی کونپل اب تک جس کے لوچ میں پیار
اور میں گرمی سردی چکھے ڈالی پر اک تنہا پات
تو سچا موتی، میں ہیرا ــــ پھرا جو برسوں ہاتھوں ہات
تو اوشا کی پہلی کرن ہے اور میں جیسے بھیگی رات
تو تاروں کے نور کی دھارا میں گہرا نیلا آکاش
میں ہوں ٹوٹتا نقشہ تو ہے جیسے شاخ نبات
تو ہے اک ایسی شہنائی جس کی دھن پر ناچے موت
تیری دُنیا جیت ہی جیت ہے، میری دنیا؟ چھوڑ یہ بات
تو ہے ایک پہیلی جس کو جو بوجھے سو جان سے جائے
تو ہے ایسی مٹی، جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان
آ میں تیرا رنگ بھی چھو دوں چھوڑ یہ بھید اور بھاؤ کی بات
میں نے وہ سرحد چھو لی ہے جہاں امر ہو جائیں پران
اے آنکھوں میں کھبنے والی! جانے کون کہاں رہ جائے
جیون کی اس دوڑ میں پگلی، ہم دونوں ہیں آج انجان

لیکن اے سپنوں کی دُنیا! تو چاہے تو رو گ مٹیں
میں نے دُنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیون کی اس دَوڑ میں ناداں یاد اگر کچھ رہتا ہے
وہ آنسو اِک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان

●

آخری ملاقات

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

آتی تھی یہ کہیں سے دلِ زنداں کی صدا
سُونے پڑے ہیں کوچہ و بازارِ عشق کے
ہے شمعِ انجمن کا نیا حُسن جاں گداز
شائد نہیں رہے وہ پتنگوں کے ولولے
تازہ نہ رہ سکیں گے روایاتِ دشت و در
وہ فتنہ گر گئے جہاں کانٹے عزیز تھے
اب کچھ نہیں تو نیند سے آنکھیں جلائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

سوچا نہ تھا کہ آئے گا یہ دن بھی پھر کبھی
اک بار ہم ملے ہیں ذرا مسکرا تو لیں
کیا جانے اب نہ الفتِ دیرینہ یاد آئے
اس حسنِ اختیار پہ آنکھیں جھکا تو لیں
برسا لبوں سے پھول تیری عمر ہو دراز
سنبھلے ہوئے تو ہیں پہ ذرا ڈگمگا تو لیں
اور اپنا اپنا عہدِ وفا بھول جائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

برسوں کی بات ہے کہ میرے جی میں آئی تھی
میں سوچتا تھا تجھ سے کہوں، چھوڑ کیا کہوں
اب کون ان شکستہ مزاروں کی بات لائے
ماضی کو اپنے حال پہ ترجیح کیوں نہ دوں
ماتم خزاں کا ہو کہ بہاروں کا، ایک ہے
شائد نہ پھر ملے تیری آنکھوں کا یہ فسوں
جو شمع انتظار جلی تھی بجھائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

●

اتفاق

دیارِ غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گذار چکنے پر
کچھ اتفاق ہو ایسا کہ ایک شام کہیں
کسی اِک ایسی جگہ سے ہو یونہی میرا گذر
جہاں ہجومِ گریزاں میں تم نظر آجاؤ
اور ایک، ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے

●

ن۔ م۔ راشد

رات کے سناٹے میں

تیرے بستر پہ میری جان کبھی
بیکراں رات کے سناٹے میں!
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند، آغاز زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے
اپنے پر تولتی ہے، چیختی ہے

بیکراں رات کے سناٹے میں
تیرے بستر پہ میری جان کبھی
آرزوئیں تیرے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں
ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو میری جان نہیں

بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور تیرے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا رُوح کو اپنی وہ سبکسار کرے
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارماں لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں میں
یہ میرے دل میں خیال آتا ہے
تیرے بستر پہ میری جان کبھی .
بیکراں رات کے سناٹے میں!

پطرس بخاری

دوراہا

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
تیرا ہی درد میری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہر احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریہ پر
یہ چشم خشک اگر ہے یہ چشم اگر تر ہے
تیرا ہی جسم چمن ہے تیرا ہی جسم بہار
تیری ہی زلف سے ہر آرزو معطّر ہے
تیرا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
میرے بیان میں اک لرزش خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے اُلفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے

وفا طلب ہے تیرا عشق اور میرے دل میں
تیری لگن کے سوا اور بیکلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور تجھ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے

مگر ہیں اور بھی طوفاں اسی زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
میری نگاہ کے ایسے بھی ہونگے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شبِ وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
میری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آ کے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبحِ زیست بھی ہے موت کی گھڑی بھی ہے

علی جواد زیدی

بھولتی ہوئی یاد

تمھیں جب یاد کرتا ہوں تو اِک مٹتی ہوئی دُنیا
میری آنکھوں کے آئینے میں پہروں جھلملاتی ہے
کہیں دم گھُٹ رہا ہے مسکراتے سُرخ پھولوں کا
کہیں کلیوں کے سینے سے ہوا رُک رُک کے آتی ہے
کہیں کجلا گئے ہیں دن کے چمکائے ہوئے ذرّے
کہیں راتوں کی ہنستی روشنی غم میں نہاتی ہے
وُہی دُنیا جو کل تک دل کا دامن تھام لیتی تھی
اسی دُنیا کے ہر ذرّے میں اب بے التفاتی ہے
تمنّا اپنی ناکامی پہ کانپ اٹھتی ہے یوں جیسے
بگولے میں کوئی سوکھی سی پتّی تھرتھراتی ہے
گھنے کہرے میں جیسے ڈھنکتے جاتے ہوں ہرے سبزے
یونہی بیتے دنوں کی شکل دھندلی پڑتی جاتی ہے
جوانی کی اندھیری رات آدھی بھی نہیں گذری
محبّت کے دیئے کی لو ابھی سے تھرتھراتی ہے

جاں نثار اختر

تجزیہ

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!
پھر بھی جب پاس تو نہیں ہوتی
خود کو کتنا اداس پاتا ہوں
گم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا دھن سمائی رہتی ہے
اک خموشی سی چھائی رہتی ہے
دل سے بھی گفتگو نہیں ہوتی
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!
پھر بھی شب کی طویل خلوت میں
تیرے اوقات سوچتا ہوں میں
تیری ہر بات سوچتا ہوں میں
کون سے پھول تجھ کو بھاتے ہیں
رنگ کیا کیا پسند آتے ہیں
کھو سا جاتا ہوں تیری جنت میں

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!
پھر بھی احساس سے نجات نہیں
سوچتا ہوں تو رنج ہوتا ہے
دل کو جیسے کوئی ڈبوتا ہے
جس کو اتنا سراہتا ہوں میں
جس کو اس درجہ چاہتا ہوں میں
اس میں تیری سی کوئی بات نہیں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!

ایک لمحہ

مُدت سے کسی کی آنکھوں سے اِک لمحے کو آنکھیں چار ہوئیں
کچھ سانس کسی کی رُک سی گئی کچھ رُوح میری تھرا سی گئی
کچھ پچھلی وفائیں یاد آئیں کچھ عہد کبھی کے یاد آئے
کچھ میری نگاہیں جُھک سی گئیں کچھ ان کی نظر شرما سی گئی

۲۵ دسمبر*

یہ تیرے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چھپائے تیرے دل کی دھڑکن
آج پھر تیری ادا سے میرے پاس آئی ہے
اپنی آنکھوں میں تیری زلف کا ڈالے کاجل
اپنی پلکوں میں سجائے ہوئے ارمانوں کے خواب
اپنے آنچل پہ تمنّا کے ستارے ٹانکے

گنگناتی ہوئی یادوں کی لویں جاگ اٹھیں
کتنے گذرے ہوئے لمحوں کے چمکتے جگنو
دل کے ہالے میں لئے ناچ رہے ہیں کب سے
کتنے لمحے جو تیری زلف کے سائے کے تلے
غرق ہو کر تیری آنکھوں کے حسیں ساغر میں
غمِ دوراں سے بہت دور گذارے میں نے

کتنے لمحے کہ تیری پیار بھری نظروں نے
کس سلیقے سے سجائی میرے دل کی محفل
کس قرینے سے سکھایا مجھے جینے کا شعور

---

* جاں نثار اختر اور ان کی مرحومہ بیوی صفیہ کی تاریخ عروسی

کتنے لمحے کہ حسیں نرم سبک آنچل سے
تو نے بڑھ کر مرے ماتھے کا پسینہ پونچھا
چاندنی بن گئی راہوں کی کڑی دھوپ مجھے
کتنے لمحے کہ غمِ زیست کے طوفانوں میں
زندگانی کی جلائے ہوئے باغی مشعل
تو میرا عزم جواں بن کے میرے ساتھ رہی
کتنے لمحے کہ غمِ دل سے ابھر کر ہم نے
اِک نئی صبحِ محبت کی لگن اپنائی
ساری دُنیا کے لئے سارے زمانے کے لئے
انہیں لمحوں کے گلاویز شراروں کا تجھے
گوندھ کر آج کوئی ہار پہنا دوں آ جا
چُوم کر مانگ تیری تجھ کو سجا دوں، آ جا

●

مخدوم محی الدین

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمنّا کا جواب آئے گا
اپنا ارمان بر افگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچے کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ معبود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا! تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب میری نیند اڑانے والے
میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ میرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تاکہ تیرے قدموں پہ میری جاں نکلے

وصال

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی
جھومر چمکا
سناٹے چونکے
آدھی رات کی آنکھ کھلی
برہا کی آنچ کی نیلی لو
نئے بنتی ہے
لے بنتی ہے
شہنائی جلتی روتی تھی
اب سر نیوہڑائے
لال پپوٹے بند کئے بیٹھی ہے
نرم گرم ہاتھوں کی مہندی
ایک نیا سنگیت سناتی

دل کے کواڑ پہ رُک کر کوئی راتوں میں ——

دستک دیتا تھا

پٹ کھلتے ہیں

آنکھ سے آنکھ، دلوں سے دل ملتے ہیں

گھونگٹ میں جھومر چھپتا ہے

گھونگٹ میں مُکھڑے چھپتے ہیں

دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں

بُوڑھا ناگ کھڑا روتا ہے

گونگے سناٹے بول اُٹھے

گھونگٹ، مکھڑے، جھومر، پائل

چمک، دمک، جھنکار امر ہے

ہار امر ہے

پیار امر ہے

پیار کی رات کی آنکھ اُمڈ آتی ہے

اور دو پھول

تنور بدن

شبنم پی کر سو جاتے ہیں

آج کی رات نہ جا!

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے، دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اُجالوں کا سلام آئے گا

آج کی رات نہ جا!

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی، زندگی دلدار بھی ہے

آج کی رات نہ جا!

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لئے تیری محبّت کی نظر

آج کی رات نہ جا!

سردار جعفری

انتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرورِ عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
خراج اپنی جوانی سے لے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتے کو دے رہا ہوں میں
بس اب نوازشِ پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عذارِ نرم پہ رنگِ بہار رہنے دے
نگاہِ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے

بتائے حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

شکستِ ساز کی ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی، ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم

اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

●

ساحر لدھیانوی

تاج محل

تاج تیرے لئے اک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگین سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے!

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشان
اس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا!

ان گنت لوگوں نے دُنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے

لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہیں
جس میں شامل ہیں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی رعنائی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے!

خوبصورت موڑ

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں!
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
میرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گذری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

کبھی کبھی

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے !
کہ زندگی تیری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گذرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو میری زیست کا مقدر ہے
تیری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم رہ کر
تیرے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
تیرا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہیں حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
تیرے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، تیرا غم، تیری جستجو بھی نہیں

گذر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گذر رہا ہوں کچھ انجانی راہگذاروں سے
مہیب سائے میری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پرہول خارزاروں میں

نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں میری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

●

ردِّ عمل

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

کیفی اعظمی

ایک لمحہ

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
خشک خشک ہونٹوں میں جیسے دل کھنچ آتا ہے
دل میں کتنے آئینے تھرتھرانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
ذہن جاگ اٹھتا ہے، روح جاگ اٹھتی ہے
نقش آدمیت کے جگمگانے لگتے ہیں
لو نکلنے لگتی ہے مندروں کے سینے سے
دیوتا فضاؤں میں مسکرانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیاں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
تشنہ تشنہ گیتی پر ابر چھانے لگتے ہیں

لمحہ بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحہ بھر کو سب پتھّر مسکرانے لگتے ہیں

●

ٹرنک کال

آج اس نے کیا تھا فون مجھے
اس کی آواز سن رہا تھا میں
نرم لہجے، مہکتی سانسوں کے
پھول ہنس ہنس کے چن رہا تھا میں

وہ کنائے، اشارے، تلمیحیں
وہ لگاوٹ، وہ لذتِ تقریر
کھینچ دی تھی فضا کے سینے پر
شوخ فقروں نے نقرئی سی لکیر

آ رہا تھا ہوا کی لہروں پر
لبِ نازک کی لرزشوں کا پیام
میں نے بے اختیار چوم لیا
چھلکا چھلکا ہوا سا رنگیں جام

ذہنِ انساں نے کر دیا آزاد
سب پیادوں کو سب سواروں کو
اُڑ گئے نامہ بر کبوتر آج
سونپ کر راز برق پاروں کو

کچھ نہیں وقت فاصلہ لیکن
فون، ایکسچینج، کاروبار میں ہے
دستِ انساں کی ہر اِک ایجاد
اہلِ دولت کے اختیار میں ہے

روز اُس کا پیام آئے گا
روز مژدہ نیا سنائے گی
فون کرنے کو نازنین کوئی
جب پڑوسی کے گھر نہ جائیگی

آج اس نے کیا تھا فون مجھے
اس کی آواز سُن رہا تھا میں

●

قتیل شفائی

ہرجائی

کھیت سے دور دہکتے ہوئے دوراہے پر
ایک سرشار جواں میں نے کھڑا پایا تھا
تمتماتے ہوئے چہرے پہ سلگتی آنکھیں
جیسے مہکے ہوئے گلزار کا خواب آیا تھا

سر پہ گاگر کے چھلکنے سے جو تارے ٹوٹے
آسماں جھانک رہا تھا مجھے حیرانی سے
ٹن سے کنکر جو پڑا میری حسیں گاگر پر
ایک نغمہ سا اُبھرنے لگا پیشانی سے

لوٹتی رات گئے گھر کو پلٹنا میرا
اک لپکتے ہوئے سائے نے ڈرایا تھا مجھے
"تم اری تم" (وہی سرشار جواں تھا شاید)
"جی، یونہی ایک سہیلی نے بلایا تھا مجھے"

کھیت بھرپور جوانی کو لُٹا بیٹھے تھے
ہر درانتی پہ تسلسل کا جنوں طاری تھا
جانے کیا دیکھ رہا تھا وہ میرے چہرے پر
اس قدر یاد ہے انگلی سے لہو جاری تھا

"کانچ کی چوڑیاں کل رات نہ ہوں ہاتھوں میں
اتنی اُونچی تیری پازیب کی جھنکار نہ ہو
سرسراتا ہوا ملبوس نہ لہرا جائے
کسی سائے کا گماں بھی پسِ دیوار نہ ہو"

جب کبھی چاند سے پگھلی ہوئی چاندی برسی
اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے
بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے

اب مگر چاندنی رات آ کے گزر جاتی ہے
پوچھتا ہی نہیں کوئی میری تنہائی کو
کھیت سے دُور دمکتے ہوئے دوراہے پر
ڈھونڈتی ہیں میری آنکھیں کسی ہرجائی کو

●

پیش گوئی

سونے کی انگوٹھی میں یہ ہیرے کا نگینہ
تحفہ تیرا لیتے ہوئے دل کانپ رہا ہے
آغاز میں انجام کی باتیں میرے محبوب
احساس کی رگ رگ میں لہو کانپ رہا ہے

وہ خواب جو میں نے تیری آنکھوں سے نچوڑا
افسوس کہ اس خواب کی تعبیر غلط ہے
میں نے تو نہ چاہا تھا یہ سونے کا دریچہ
شائد ترے فردوس کی تعمیر غلط ہے

افسوس میری مصلحت اندیش محبت
دل سے نہیں، سونے سے مجھے تول رہی ہے
لیکن میرے محبوب اسے کون چھپائے
وہ راز جو ہیرے کی کنی کھول رہی ہے

ڈھل جائینگے جس وقت شفق زار لبوں سے
جب حسن کے شاداب نظارے نہ رہیں گے
جب چاند سے ماتھے پہ نہ پھوٹے گا اُجالا
جب رات کی آنکھوں میں ستارے نہ رہینگے

ہو جائیگا عریاں تیری فطرت کا تلوّن
ہیرے سے اتر جائیگا سونے کا لبادہ
جس وقت میں آفاق میں رہ جاؤں گی تنہا
ہیرا میرے کام آئیگا سونے سے زیادہ

سلام مچھلی شہری

معزّز تتلیو!

معزّز تتلیو! تم کو یقیناً یہ خبر ہو گی
تصوّرِ حُسن کا بھی عشق ہی کے ساتھ بدلا ہے

اگر اپنی امنگوں کی حسیں شہزادیاں تم ہو
تو ہم بھی خسروانِ سیم و زر سے ڈر نہیں سکتے
اگر تم آج شیریں اور لیلیٰ ہو نہیں سکتیں
تو ہم بھی قیس اور فرہاد بن کر مر نہیں سکتے

اگر سائنس کے اس دور میں تم آسمانوں سے
سراپا خلد کی رنگیں فضائیں بن کے اُتری ہو
اگر تم سرمئی سڑکوں پہ اپنی سُرخ کاروں سے
اجنتا کی برہنہ اپسرائیں بن کے اتری ہو

اگر یہ ہے تو ہم بھی کج کلاہانِ تغیّر ہیں
اجنتائیں ہمارے کارخانوں کی ہیں پروردہ

تمہارے عارض و لب کو ہمیں شرنگار دیتے ہیں
تمہاری ہر ادا ہم سخت جانوں کی ہے پروردہ!

جہانِ تازہ کو جاگے ہوئے فرہاد راس آئیں
مبارک حُسن کا اس دور میں خلدِ نظر ہونا
فضائے برق و آہن میں، خلائی شاہراہوں پر
مبارک تتلیو! تم کو ہمارا ہمسفر ہونا

مگر تم کاغذی گلدان بن کر آگ کی جانب
اگر اس طرح آؤ گی تو پھر جلنا بھی لازم ہے
اگر ہر رنگ میں تم خود ہی مدرا لے کے نکلو گی
تو پھر مئے کی طرح ہر جام میں ڈھلنا بھی لازم ہے

تمہارا حُسن تازہ زندگی کی شمعِ رنگیں ہے
نظامِ زندگی لیکن ہمارے ہاتھ بدلا ہے!!

●

جمیل ملک

ایثار

میں تجھے دیکھنے آیا تھا سرِ بسترِ مرگ
موت کے وقت بھی تھے تیری جبیں پر پہرے
خوفِ رسوائی سے تو بات نہ کر سکتی تھی
تیری آنکھوں سے ہویدا تھی مگر دل کی جلن
ٹکٹکی باندھ کے یوں دیکھ رہی تھی جیسے
تو کہیں آج مجھے دل میں چھپا ہی لے گی
اور پھر تجھ سے تیرا پیار نہ چھینے گا کوئی
— دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں آنکھیں تیری
بجھ گئے تیری محبت کے ضیا بار دیئے
اور میں یاس کی تصویر بنا سوچتا تھا
حسن اور موت کی آغوش میں یوں سو جائے
اُف یہ نوخیز محبت کا بھیانک انجام

میرے احساس کے مندر کی مقدس دیوی
اپنی خاموش محبت پہ ندامت ہے مجھے

لاکھ چاہا کہ میں اظہارِ محبت کر لوں
تیری بالیں پہ تجھے دل کی حکایت کہہ دوں
لیکن افسوس کہ لب بند زباں گنگ رہی
میں بھی تیری ہی طرح حلقۂ زنجیر میں تھا
جس میں صدیوں سے محبت کی جوانی ہے اسیر
—— کس کو معلوم ہے یہ کون بتا سکتا ہے
دمِ آخر ترے احساس پہ کیا گذری ہے!
تہہِ مدفن بھی تجھے چین ملا ہے کہ نہیں!!

میرے جذبات کو مہمیز لگانے والی
میں ترے پیار کا احسان نہ بھولوں گا کبھی
تو نے جان دے کے میرے دل کو وہ غم بخشا ہے
جو سمٹ جائے تو پیوستِ رگِ جاں ہو جائے
اور پھیلے تو ہر اک درد کا درماں ہو جائے

●

شورش کاشمیری

کہانی

دور پنگھٹ پہ ستاروں کی جوانی لے کر
چند شاداب شگوفے پھوٹے
رشکِ ماہتاب شگوفے پھوٹے
اپنی رفتار میں لہروں کی روانی لے کر

پھول تھے عصمت و عفت کے سرِ راہگذار
چشمِ میگوں میں شراب
ایک بے داغ شباب
نغمہ و شعر کے گوہر تھے کہ انمول شرار

اپنے آنچل کو سنبھالے ہوئے شرمائے ہوئے
ایک گمنام کہانی گذری
موسمِ گل کی جوانی گذری!
گاگریں سر پہ اٹھائے ہوئے بل کھائے ہوئے

کھیت میں باغ میں ہے راہگذر پھیل گئی
اِک گڈریے نے ترانہ چھیڑا
وقت کے ساتھ فسانہ چھیڑا
آگ تھی آگ کہ تا حدِ نظر پھیل گئی

●

رات کی بے سکوں خموشی میں
رو رہا ہوں کہ سو نہیں سکتا
راحتوں کے محل بناتا ہے
دل جو آباد ہو نہیں سکتا!

دور شمعِ خیال کے مانند
شمع وادی کی جھلملاتی ہے
یاس کے بیکراں اندھیرے میں
ایک امید مسکراتی ہے

دور پربت کے پاس چرواہا
کھو گیا غم فزا ترانوں میں
بین کرتی ہے روح زخم آلود
بانسری کی نحیف تانوں میں

تیرے جانے کا غم بھلاتا ہوں
تیرے جانے کی یاد آتی ہے

ہائے اس بے بسی کے عالم میں
کس زمانے کی یاد آتی ہے!

شب کو ویران رہگذاروں سے
سر جھکائے ہوئے گذرتا ہوں
قہقہوں میں قرار کھویا تھا
آنسوؤں میں تلاش کرتا ہوں

●

شاہدہ

کسی سنولائی ہوئی شام کی تنہائی میں
دو سرکتے ہوئے سایوں میں ہوئی سرگوشی
بات چھوٹی تھی مگر پھیل کے افسانہ بنی

میں نے اکثر یہی، سوچا تیرا ہموار بدن
نقرۂ ناب کا ترشا ہوا ٹکڑا ہوگا
دودھیا سرو ——— حرارت سے تہی
جس پہ طاری ہو خود اپنے ہی تصور کا جمود
کوئی اعجازِ پرستش جسے چونکا نہ سکے

تو مگر ——— پھول کی پتّی سے سبک تر نکلی
اوس کے لمس سے جو آپ ہی جھک جاتی ہو
اِک ہلورا بھی جسے چوٹ لگا سکتا ہے
تو مگر خوابِ محبت تھی فرشتوں نے جسے

بیٹھ کر چاند ستاروں میں بنا صدیوں تک
اپنے بلور کے ایوان سجانے کے لئے
دمِ گفتار تیرے ہونٹوں سے رِستی ہوئی بات
جیسے یاقوت کی سِل چیر کے جھرنا پھوٹے
اور گیتوں کے بہاؤ میں مخاطب کو لئے
چھوڑ آئے کسی رومان بھری وادی میں

تیری شاداب جوانی کی ضیا نے اکثر
ہالۂ نور میرے گرد کیا ہے تعمیر
اور میں حجلۂ تنویر میں پہروں بیٹھا
تیرے مانوس تنفس کی صدا سنتا رہا

ابھی کچھ اور بھی راتیں ہیں پسِ پردۂ غیب
ابھی کچھ اور بھی نغمے ہیں پسِ پردۂ ساز
کئی راتوں کئی نغموں سے گزرنا ہوگا
دیکھ! وہ چاند کی چوٹی کا چمکتا مینار
اسی مینار میں دونوں کو پہنچنا ہوگا

حامد عزیز مدنی

شمع بجھتی ہے تو.......

جاگتے جاگتے وہ پچھلے پہر تک اے دوست!
کتنی یادوں کے ورق اب بھی الٹتا ہوگا
صبح کا دامنِ صد چاک تیری آنکھوں میں
خواب کی بجھتی ہوئی راکھ سے بنتی ہوگی
نیند اِک شعلۂ تریاق تیری آنکھوں میں
تیرے کمرے کی اداسی تجھے ڈستی ہوگی!
اس کی تنہائی کے دامن میں حجاب آلودہ
رقص کرتی نہ ہو شادابیٔ شب ہائے وصال
اس کے سایوں میں لباس اپنا بدلتے ہونگے
تیرے اندازِ تبسم تیرے خواب مہ و سال
تیرے ہونٹوں پہ لرزتا نہ ہو بوسوں کا تپاک!
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں چھلکتا آنسو
کس جتن سے سرِ مژگاں ہی سنبھلتا ہوگا
کرب اچٹی ہوئی نیندوں کا وہ افسانہ ہے
صبح تک سینکڑوں عنوان بدلتا ہوگا

بھیگتی رات کہ اک قافلۂ درد بھی ہے
تیری پلکوں کی گھنی چھاؤں میں آتے ہوں گے
اِک مسافر کی طرح خواب بھی دم لینے کو
میرا سایہ تیری آنکھوں میں لپکتا ہوگا
راہ کے موڑ پہ دزدیدہ قدم لینے کو
لیکن ان تند ہواؤں میں ٹھہرنا تھا محال!
نقشِ پا رہ گئے باقی کوئی منزل ہے نہ میل
ایک صحرا کا بگولا ہے ہر اِک مہمل بھی
سینۂ خاک سے اٹھتا ہے دھواں صدیوں کا
نظر آتی ہے سیہ پوش تیری محفل بھی

●

وہ چند لمحے
وہ کیف و مستی کے چند لمحے
جو ساتھ تیرے گذار آیا ہوں خواب زاروں کی وسعتوں میں
وہ چند لمحے
کہ تیرا آغوشِ احمریں تھا مجھے میسّر
میں سوچتا تھا
کہ زندگی آج رقص و نغمہ میں ڈھل گئی ہے
مگر طلسمِ خیال ٹوٹا
یہ خود فریبی نہ کام آئی

وہی جہنم
میں جس سے بھاگ آیا تیرے آغوشِ پُرسکوں میں
وہی تلاطم
میں چھوڑ کر جس کو نکلا ساحل کی جستجو میں

اسی جہنم میں خود کو پایا
اسی تلاطم کی کشمکش کا شکار ہو کر ——— سسک رہا ہوں

اعجاز بٹالوی

مسافر

زمانے کی گردش کہاں کھینچ لائی
نہ صحرا نہ گلشن فقط یہ چٹانیں
محبّت کی ناکامیوں کی زبانیں
اور ان سنگ زاروں کے آنسو یہ چشمے
کسی کوہکن کی تمنّا کی بے حاصلی پر بہے جا رہے ہیں
بہت دور بادل کی جھالر سجائے
وہ چاند اپنے تاروں سے محفل سجائے
کہ جیسے ستاروں کی الفت میں کھو کر
زمیں کی اسے کوئی پروا نہیں ہے
خلاؤں کے سینے پہ بہتی ہوائیں
نہ کوئی سندیسہ نہ پیغام لائیں
یہ سنگین خاموشیاں پربتوں کی
اور ان اجنبی وادیوں کا مسافر
میرا دل —— تمہاری محبت کا عادی

ابن انشا

سائے سے

کیوں میرے ساتھ ساتھ آتا ہے ؟
میری منزل ہے بے نشاں ناداں
ساتھ میرا تیرا کہاں ناداں
تھک گئے پاؤں، پڑ گئے چھالے
منزلیں ٹمٹما رہی ہیں —— دور
بستیاں اور جا رہی ہیں —— دور
میں اکیلا چلوں گا اے سائے !
کون عہدِ وفا نبھاتا ہے
کیوں میرے ساتھ آتا ہے
تو ابھی جا ملے گا سایوں میں
میں کہاں جاؤں میں کہاں جاؤں
کس کی آغوش میں اماں پاؤں

حبیب جالب

متاعِ غیر

آخرِ کار یہ ساعت بھی قریب آپہنچی
تو میری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کب تلک میرا مقدر رہتی تیری زلف کی شام
کیا تغیّر ہے کہ اب غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں تو اب نہ کبھی آئیگی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عین خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا

میری دمساز زمانے سے چلی آتی ہے
رہنِ غم وقفِ الم سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رد لیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

کمال احمد صدیقی

خط کے جواب میں

ہاں نہیں تیری رفاقت کی ضرورت مجھ کو
میری نرس، میری ہمدم، میری تنہائی ہے
خیر مقدم تیرے جذبوں کا نہیں کر سکتا
تو نے کیوں میری محبت کی قسم کھائی ہے

میرے نغموں کی پرستار تجھے کیا معلوم
میرے اشعار کی بازار میں قیمت کیا ہے
چند سکے جو میرا پیٹ نہیں بھر سکتے
تیرے نزدیک مگر ان کی حقیقت کیا ہے

کیا تجھے میری دعائیں یہاں لے آئی ہیں
چند سکوں کے لئے میں نے وطن چھوڑا ہے
میری حالت کو اگر سمجھے تو سمجھے وہ غزال
آب و دانہ کے لئے جس نے ختن چھوڑ دیا

جن میں ہر لمحہ تمناؤں کا خوں ہوتا ہے
ان فضاؤں میں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
تجھ کو معلوم نہیں، ساغرِ زہراب تو کیا
خون کے گھونٹ بھی پی لیتے ہیں پینے والے

پیش خیمہ ہی نہ ہو یہ میری بربادی کا
مجھ کو اس تیری نوازش سے بھی ڈر لگتا ہے
سرد اور گرم زمانے کے بہت دیکھے ہیں
اپنے شعروں کی ستائش سے بھی ڈر لگتا ہے

تو میرے عشق کا دم بھرتی ہے لیکن تجھ کو
عشق مجھ سے نہیں خود اپنے ہی جذبات سے ہے
مفلسی میری بدل دے گی اسے نفرت میں
یہ عقیدت جو تجھے آج میری ذات سے ہے
ہاں نہیں تیری رفاقت کی ضرورت مجھ کو!

حمایت علی شاعر

حاصلِ غم

سوچتا ہوں تو غمِ دل پہ ہنسی آتی ہے
کتنے نادان ہیں ہم عشق کے مارے ہوئے لوگ
زندگی کیا ہے حقیقت میں سمجھتے ہی نہیں
اپنے ماحول کی قبروں میں اتارے ہوئے لوگ
ایک موہوم تصور ہے کہ جس کے اطراف
گھومتے رہتے ہیں ہم زیست کے ہارے ہوئے لوگ

وہ حسیں شکل کہ جس کے لئے دل نے اب تک
کسی کعبے کسی بُت خانے میں سجدہ نہ کیا
ہر شبِ ہجر گذاری ہے بہ اندازِ وصال
کسی غم کو کبھی خلوت میں بھی رسوا نہ کیا
ہر نفس ایک جہنم کی تپش سے گذرا
اور اشکوں سے بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہ کیا

وہ حسین شکل بھی آخر ہے اِک انساں پیکر
اور وہ پیکر کسی پتھر کا تراشیدہ نہیں
کوئی انسان ہو، دل ہے تو یہ دنیا بھی ہے
اور اس شیشے سے نازک تو کوئی شیشہ نہیں
آدمی کیا ہے اگر حسِ لطافت مٹ جائے
زندگی کیا ہے گر آسائشِ یک لمحہ نہیں

آج جب عشق غمِ زیست سے ٹکرایا ہے
ٹوٹ کر رہ گیا خوابوں کا ہر اک تاج محل
کسی تخئیل کو اب دعوئے فردوس نہیں
دل ہے اب اپنی تمناؤں کا خود اِک مقتل
کوئی ساعت ہو کوئی رہگذر ہو ہر گام
زیست کی تاک میں بیٹھی نظر آتی ہے اجل

●

احمد راہی

آنکھوں سے دِل تک

میں کہہ رہا ہوں
خموش رہ کر بھی حرفِ مطلب بیان کرنے میں کس قدر
دسترس ہے تم کو

وہ کس سلیقے سے تم نے مجھ کو بتا دیا تھا
کہ تم میری ہو
تمہارے ہونٹوں پہ چپ کی مہریں تھیں اور بہکی ہوئی نگاہیں
بس ایک پل کے لئے اٹھیں، اک چمک سی لہرائی ان میں
اور جھک گئیں

یہ آغازِ داستاں تھا!
خموش کیوں ہو؟
خموش رہ کر بھی حالِ دل تم چھپا سکو گی، تمہیں یقیں ہے؟
تمہاری پلکوں کی چلمنوں سے تمہارے بے برگ و بار
ارمان جھانکتے ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ چپ کی مہریں ہیں اور سہمی ہوئی نگاہیں
(ہزار ہا حسرتوں کا مدفن)

نہ کہنے پر بھی مجھے یہ سب کچھ بتا چکی ہیں
تمہاری اس خامشی کا اندازِ گفتگو میں سمجھ گیا ہوں
میں جانتا ہوں کہ آج تم اس قدر ملول و اداس کیوں ہو
خموش کیوں ہو ———
کہو یہ انجامِ داستاں ہے!

●

غمگساری

دوست مایوس نہ ہو!
سلسلے بنتے بگڑتے ہی رہے ہیں آخر

تیری پلکوں پہ سر اشکوں کے ستارے کیسے
تجھ کو غم ہے تیری محبوب تجھے مل نہ سکی
اور جو زلیست تراشی تھی تیرے خوابوں نے
آج وہ ٹھوس حقائق میں کہیں ٹوٹ گئی

تجھ کو معلوم ہے میں نے بھی محبت کی تھی
اور انجامِ محبت بھی ہے معلوم تجھے

ان گنت لوگ زمانے میں رہے ہیں ناکام
تیری ناکامی نئی بات نہیں دوست میرے
کس نے پائی ہے بھلا زیست کی تلخی سے نجات
چار و ناچار یہ زہراب سبھی پیتے ہیں
جاں سپاری کے فریبندہ فسانوں پہ نہ جا
کون مرتا ہے محبت میں سبھی جیتے ہیں

وقت ہر زخم کو، ہر غم کو مٹا دیتا ہے
وقت کے ساتھ یہ صدمہ بھی گذر جائیگا
اور یہ باتیں جو دہرائی ہیں میں نے اس وقت
تو بھی اک روز انہیں باتوں کو دہرائے گا

دوست مایوس نہ ہو

اختر ہوشیارپوری

تبدیلی

یہ ابھی بات ہے کل کی میں یہاں آیا تھا
اور تجھے دیکھ کے محسوس کیا تھا میں نے
کسی ان دیکھے جزیرے کی تو شہزادی ہے
جس کی آغوش ہے آغوشِ بہاراں کی طرح
جس کے گالوں سے سحر پھول چنا کرتی ہے
جس کی زلفوں کے خم و پیچ یہ دیتے ہیں پتہ
کارواں کیسے بدل دیتے ہیں راہیں اپنی

آج لیکن تیرے انداز کی رعنائی میں
ایک نادان تمنّا کا نشاں ملتا ہے
ہونٹ اظہار سے محروم و سراسر اظہار
آنکھیں احساس سے بوجھل ہیں نظر خواب سے چور
نرم رخساروں پہ ٹوٹے ہوئے تاروں کے نشاں
اندر نفس ہیں کہ افسونِ شکستہ کوئی
سوچتا ہوں کہ میں کل ہی تو یہاں آیا تھا

نریش کمار شاد

کشمکش

سوچتے سوچتے پھر مجھ کو خیال آتا ہے
وہ میرے رنج و مصائب کا مداوا تو نہ تھی
رنگ افشاں تھی میرے دل کے خلاؤں میں مگر
ایک عورت تھی علاجِ غمِ دُنیا تو نہ تھی

میرے ادراک کے ناسور تو رستے رہتے
میری ہو کر بھی وہ میرے لئے کیا کر لیتی
حسرت و یاس کے گمبھیر اندھیرے میں بھلا
ایک نازک سی کرن ساتھ کہاں تک دیتی

اس کو رہنا تھا زر و سیم کے ایوانوں میں
رہ بھی جاتی وہ میرے ساتھ تو رہتی کب تک
ایک مغرور ساہوکار کی پیاری بیٹی
بھوک اور پیاس کی تکلیف کو سہتی کب تک

سلیمان ادیب

پیشکش

میں ترے حسن کی تعریف ہی کرتا رہتا
تیری تعریف کے الفاظ اگر مل سکتے
اُف ری بے مائگیٔ دامنِ گلزارِ زباں
ایک دو پھول ہی مطلب کے مگر مل سکتے

لالہ و گُل ہوں کہ نرگس ہو کہ سرو و شمشاد
میں کسی سے بھی کوئی کام نہیں لے سکتا!
"تیرے رخسار و لب و چشم و قد و قامت کو
میں کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا!

جانے کب تک تجھے اللہ نے شاعر بن کر
شعرِ نازک کی طرح ذہن میں سوچا ہوگا
جب کہیں دہر کے دیوانِ مصوّر میں تجھے
گنگناتے ہوئے گاتے ہوئے لکھا ہوگا

شاذ تمکنت

التجا

شام الساگئی گھبرا ہوا صحرا کا سکوت
وادیاں ڈوب گئیں کھو گئے ٹیلے میداں
تم نے جس موڑ پہ تھاما ہے میرا دستِ جنوں
دیدنی تھا وہیں سائے کی جدائی کا سماں

آج تک خون کی گردش میں رواں ہے کوئی
رگِ احساس میں ٹوٹے ہوئے نشتر کی طرح
کسی آہو کی فراموش صفت آنکھوں میں
میں رہا بھی تو سرائے کے مسافر کی طرح
کسی اجڑے ہوئے مندر کا پروہت بن کر
کسی کعبے سے نکلے ہوئے پتھر کی طرح
اپنے ہاتھوں سے مٹا دو کسی بے مہر کا نام
ثبت ہے میری جبیں پر جو مقدر کی طرح

بلراج کومل

راستے پر

تھک گیا تھا راستہ چلتے ہوئے
اور ستانے کی خاطر بیٹھ کر
ایک لمحے کے لئے سوچا تھا یہ
اپنا جینا بھی بھلا کوئی بات ہے
زخم جیسے جل رہا ہو درد سے
اور اپنی آرزوئے غم زدہ
جس کو خالی آس کے سائے ملے
اُلفتِ معصوم رو کر سو گئی
چاہ تھی دل کو مسرّت کی مگر
ہر گھڑی جلتے سلگتے ہی کٹی!

اور پھر دل میں خیال آنے لگے
چار سُو بکھرا ہوا ہے غم ہی غم
پھر گئیں آنکھوں میں لاکھوں صورتیں
جن کی جانب چند لمحوں کے لئے

جانے کیوں ملمت رہا سہما ہوا
میں نے سوچا، جیسے ان لوگوں کا غم
ایک زندہ کشمکش ہے اور میں
محبسِ آہ و فغاں میں بند ہوں
اس گھڑی سے چاہتا ہوں کہہ سکوں
کاش ہم رونے سے پہلے سوچتے
درد کا درماں تڑپنے میں نہیں!!

باقر مہدی

سزا

بھول جانا انہیں آسان نہیں ہے اے دل!
تو نے پہلے بھی کئی بار قسم کھائی ہے ــــــ
درد جب حد سے بڑھا ضبط کا چارا نہ رہا
ان کی ایک ایک ادا یاد مجھے آئی ہے ــــــ

وہ تبسم میں نہاں طنز کے میٹھے نشتر
وہ تکلم میں تغافل کو چھپانے کی ادا
رک گئے ہر لمحہ نئی طرز سے آغازِ ستم
جیسے کچھ کھو کے کسی چیز کو پانے کی ادا
وہ مسلسل میری باتوں پہ توجہ کی نظر
رُخ پہ مچلی ہوئی زلفوں کو ہٹانے کی ادا
رخصتی لمحوں میں ہونٹوں پہ دعاؤں کا گماں
در پہ رک کر میری خاطر سے وہ جانے کی ادا

آج رہ رہ کے تڑپتا ہوں نئی بات ہے کیا
دل نے کیوں ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے

وہ ستم لاکھ کریں ان کا تو شیوہ ہے یہی
عشق کی ترکِ محبت میں بھی رسوائی ہے

اب تو جلتے ہوئے جینا ہی پڑیگا اے دل
'تونے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے'

تیغ الہ آبادی

فاصلہ

رات آئی تو چراغوں نے لَویں کم کر دیں
نیند ٹوٹی تو ستاروں نے لہو نذر کیا
کسی گوشے سے دبے پاؤں چلی بادِ شمال
کیا عجب اس کے تبسّم کی ملاحت مل جائے
خواب لہرائے کہ افسانے سے افسانہ بنے
ایک کونپل ہی چٹک جائے تو پھر جام چلے
دیر سے صبحِ بہاراں ہے نہ شامِ فردوس
وقت کو فکر کہ وہ آئے تو کچھ کام چلے

دھوپ اتری تو وہی شامِ غریباں جس میں
اپنے سینے پہ مزاروں کا گماں ہوتا ہے
غم بھی ملتے ہیں تو جیسے کوئی دولت مل جائے
لو بھی چلتی ہے تو احسان سے سر جھکتا ہے
آخری آس بھی ٹوٹے تو بڑا لطف و کرم
ریت کے پیار سے طوفاں کے جھکولے اچھے
آگ لگ جائے جو گھر کو تو چلو جشن ہوا
اپنے معمول کی اس راکھ سے شعلے اچھے

پریم وار برٹنی

سہاگ رات

دودھیا جسم سے اٹھتی ہوئی صندل کی مہک
میرے جذبات میں کہرام مچا دے نہ کہیں
یہ کھُلے بال یہ دزدیدہ نگاہوں کا فسوں
ہوش، مستی بھری راتوں کے اڑا دے نہ کہیں

یہ مچلتے ہوئے جذبے یہ دھڑکتے ہوئے دل
کفر و ایمان کی پہچان نہ جانے کیا ہے
دو جواں جسم، حسیں پھُول، حسیں تنہائی
آج کی رات کا فرمان نہ جانے کیا ہے

گوری گدرائی ہوئی ریشمی باہوں کا گداز
یہ مہکتی ہوئی سانسیں یہ مہکتے ہوئے راز
حسن اور عشق کی سرمستیاں اللہ اللہ
رات کے پچھلے پہر جیسے فرشتوں کی نماز

میری باہوں میں پریشاں ہیں گھنیری زُلفیں
ایک مہتاب مجسم میری آغوش میں ہے
کیا قیامت کا نشہ ہے یہ جوانی کا نشہ
لاکھ میخانوں کی مستی دلِ مدہوش میں ہے

گول گلنار دمکتے ہوئے رُخساروں پر
زلف لہرا کے غضب ڈھاتی ہے کیسے کیسے
اُف یہ نوخیز جوانی کے دلاویز ابھار
کسی مغرور شوالے کے کلس ہوں جیسے

زندگی لمس بہ لب ہے تو جوانی سرشار
اُف یہ بیخواب دھڑکنوں کا پُراسرار سماں
کون روکے گا اُمڈتے ہوئے طوفانوں کو
دھڑکنیں تیز ہیں خاموش ہے خلوت کی زباں

عشق چومے گا ابھی چاند کی پیشانی کو
جگمگا اٹھے گا سوئے ہوئے خوابوں کا سہاگ
پھیل جائیگی افق تا بہ افق آج کی رات
دو محبت بھرے سینوں کی مہکتی ہوئی آگ

یہ مہکتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی آگ
نرم نیندوں کے شبستانوں میں ڈھل جائیگی
چاند کی شمع اسی آگ سے روشن ہوگی
آج کی رات اسی آگ میں جل جائے گی

●

نُور بجنوری

پاک دامن

راٹ نے کھول دِئے اپنے ملائم گیسو
میرے سرتاج یہ ماتھے پہ شکن کیسی ہے ؟
سیج کی گود میں ہنستے ہوئے پھولوں کی قسم
آج ہر بات میں کانٹوں کی چبھن کیسی ہے ؟

آئیے، بربطِ ناہید پہ ایک دُھن چھیڑیں
دیکھئے، پھر میں کوئی گیت نہیں گاؤنگی
ٹھہریئے چاند کی کرنوں سے حسیں خواب بُنیں
جائیے، میں بھی کبھی پاس نہیں آؤں گی

وُہی بیتی ہوئی باتیں، وُہی جھُوٹے قصّے
ایک سودائی کے بھٹکے ہوئے افسانے چند
ایک شاعر کی غلط گوئی کے رنگیں طومار
ایک مفلس کے بسائے ہوئے ویرانے چند

میں نے چھُپ چھُپ کے دریچوں سے کس کو جھانکا ہے ؟
میں نے کب اشک بہائے ہیں بتائے کوئی ؟
میں نے خط لکھے ہیں، میں اس سے ملی ہوں افسوس !
کیسے ان پیاس بھرے شعلوں کو بجھائے کوئی ؟

آپ کے سر کی قسم آپ کے قدموں کی قسم
میری پازیب کی گاتی ہوئی جھنکار ہیں آپ
میرے ہاتھوں کی حِنا، میری کلائی کی کھنک
رنگِ تخیّل میں رعنائیٔ افکار ہیں آپ

چھوڑیئے ! اب میں کبھی پاس نہیں آؤں گی
آپ کے سر کی قسم آج میں مر جاؤں گی

●

کرشن موہن

فریبِ محبت

یہ تیسرا فریبِ محبت ہے مالتی
میں آج پھر فریبِ محبت میں آ گیا

رخسار دل شکار ہیں، آنکھیں ہیں دلنشیں
شعلہ زنِ خرد ہے ترا حسنِ آتشیں
میں سوچتا رہا — میں بہت سوچتا رہا
لیکن ترا اجمال نظر میں سما گیا
یہ سُرخ سُرخ ہونٹ قیامت ہی ڈھا گئے
سرمایۂ شکیب مرا اُلٹ گیا یہیں
اور میرا ساتھ چھوڑ گئی عقلِ دُور بیں
پھر دل نے ایک غیر کو اپنا سمجھ لیا

گو جانتا ہوں یہ بھی تمنّا کا ہے فریب
گو مانتا ہوں راہِ محبت ہے پُر نشیب

لیکن بغیر اس کے بھی چارا نہیں میرا
کچھ بھی بجز فریب سہارا نہیں میرا
تجھ سی پری جمال حسیناؤں کے بغیر
میں ہوں صنم پرست گذارا نہیں میرا

میں آج پھر فریبِ محبت میں آ گیا
یہ تیسرا فریبِ محبت ہے مالتی

قاضی سلیم

بازگشت

سرسراتے ہوئے پردوں سے گذر آیا تھا
ابھی کچھ دیر ہوئی گرم ہوا کا جھونکا
جس نے بے وجہ یکایک ہمیں چونکایا تھا

تھا میں نزدیک ترے، تجھ کو مخاطب تھا ابھی
ایک پلکارے ہی میں نہ جانے کہاں جا پہنچا
وہ کوئی اور ہی عالم تھا یہ دنیا تو نہ تھی

ایسا محسوس ہوا جیسے بہت دن پہلے
آج کچھ یاد نہیں کتنا زمانہ گذرا
ہُو بہُو ایسے ہی حالات سے ہم گذرے تھے

یہی موسم کی لطافت تھی یہی رنگِ فضا
یہی ملبوس، یہی پھُول، یہی تصویریں
یہی رخسار، یہی لب، یہی زُلفوں کی گھٹا

تیرے گھونگھٹ میں دہکتا ہوا خورشید یہی
ہاں اسی طرح کی ایسی ہی معطّر سانسیں
شوقِ بیتاب یہی، ضبط کی تاکید یہی

جسم تحلیل ہوئے جاتے تھے تارے کی طرح
بارِ جذبات فراواں سے نگاہیں مخمور
لب سے ہر لفظ نکلتا تھا شرارے کی طرح

یہی پردے تھے کہ پھر ایسے ہی پردے ہونگے
جن کی ہر جنبشِ مشکوک پہ سہمے ہوئے دل
جانے کب پہلے اس انداز سے دھڑکے ہونگے

بے سبب خوف یہی، جس کا نہیں کوئی جواب
پڑھ نہ پائے کوئی ابرو کی شکستہ تحریر
التفاتِ نگہِ ناز کا بے ربط انداز

ایک پل کے لئے ٹوٹا تھا نگاہوں کا فسوں
زیرِ لب ایک تبسّم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
لوٹ آیا وہی تنہائی کا خوابیدہ سکوں

ایسا محسوس ہوا تھا کہ بہت دن پہلے
مجھ کو اب یاد نہیں کتنا زمانہ گذرا
ہو بہو ایسے ہی حالات سے ہم گذرے تھے

سید فیضی

بہتی آگ

ابھی ابھی ایک یاد ابھری ہے زندگی کے حسیں بھنور سے
فضاؤں میں اعتدال کیوں ہے ؟
میں کیسے سوچوں کہ مجھ کو اپنی تباہیوں پہ ملال کیوں ہے ؟
یہ جانتا ہوں کہ سوچ میری ہے، میں جو چاہوں تو سوچ سکتا ہوں۔
ایسی باتیں جہاں رسائی نہیں ہے آساں !
مگر ——— یہ چاہتا اصل میں ہے میری بہارِ نظر کا ساماں

یہ زندگی کا حسیں بھنور ہے
نظر کی گہرائیوں سے اُٹھتا ہے آگ اگلتا ہوا تبسم
کئی تبسم نہاں تھے جن کو حسین لمحوں نے یوں ابھارا
کہ جیسے گرداب رقص میں ہو، ہوا کے آنچل پہ ابر پارہ
میں آج تک سوچتا رہا ہوں ———
تمہیں کہو، مجھ کو دیکھنے والو، میں تمہاری نظر میں کیا ہوں ؟
میں اب تو خوگر سا ہو چکا ہوں، مجھے کچھ اس سے غرض نہیں ہے
کوئی بھی یاد آئے یا نہ آئے
یہ زندگی ——— اک وسیع اندھا کنواں ہے، جس کی تہہ میں
شاید ہزاروں یادیں سلگ رہی ہیں

شاد امرتسری

کتبہ

پاؤں ہولے سے رکھو اور بھی آہستہ چلو
وہ یہاں پھولوں کے انبار تلے لیٹی ہے
بات چپکے سے کرو، جو بھی کہو دھیرے کہو
وہ ابھی کلیوں کے کھلنے کی صدا سنتی ہے

ہائے وہ بال، گھنے لمبے، سجیلے، کالے
جن کے کھلنے سے گلابوں کی مہک آتی ہے
ہونٹ، وہ ہونٹ، بھرے جیسے ہوں رس کے پیالے
جن کے چھونے سے میری روح بہک جاتی ہے

اب گراں بوجھ لئے پھولوں کے انبار تلے
پیرہن چاک کئے دیر سے چپ بیٹھی ہے
میں یہاں خون اگلتا ہوں کہ یہ وقت ٹلے
وہ کسی نشے میں مدہوش پڑی سوتی ہے

پاؤں ہولے سے رکھو اور بھی آہستہ چلو
بات چپکے سے کرو، جو بھی کہو دھیرے کہو

رضی اختر شوق

وحشتِ نیم شب

آج مہتاب کس دُھند میں کھو گیا
رات کی مانگ بے کہکشاں ہو گئی
وسعتِ بام پر تلملاتی کرن
سایۂ گیسوئے دلبراں ہو گئی
ہر شبستاں میں سائے اُبھرنے لگے
دل میں بے نام تیشے اترنے لگے
وقت کا کارواں گوش بر ساز ہے
صرف دِل کے دھڑکنے کی آواز ہے
دل سے کہتی ہے یہ عقل کی روشنی
کتنی قاتل ہے یہ ہجر کی رات بھی
میرے اور میرے خورشید کے درمیاں
جس نے پیدا کئے وقت کے فاصلے
جس کے صحراؤں میں زرد رو نیم جاں
پھرتے رہتے ہیں عشاق کے قافلے
اشک دیتے ہیں زندہ دلی کی سزا
زخم دیتے ہیں حسن وفا کے صلے

کون جانے کہ ہو کون سی شام کو
اس کے جلووں سے گلنار میری نظر
کون سی صبح سونا بکھیرے گی جب
اس کی خوشبو سے ہوگا یہاں سے گذر
اس کے قدموں کی لَو سے بکھر جائیگی
ایک چاندی کی رو رہگذر رہگذر
دل کی ٹھنڈک نظر کے سکوں کے لئے
اور کرنا ہے اشکوں کو کتنا سفر

●

کیفؔ رضوانی

تمنّائے خواب

میں نے اک خواب؛ دیکھا تھا کچھ دن ہوئے
ایک چھوٹا سا گھر ہے محبت بھرا
جس میں ماں باپ ہیں بہن ہے بھائی ہے
کچھ پریشانیاں ہیں تمنّائیں ہیں
زندگی پھر بھی ہنستی نظر آئی ہے
دوست ہیں ملنے والے ہیں غمخوار ہیں
رنگ و نکہت کی اک بزم آباد ہے
ہر طرف قہقہے، چہچہے، زمزمے
فکرِ فردا سے ہر شخص آزاد ہے
ایک معصوم لڑکی جھجکتی ہوئی
کہہ رہی ہے " وفا کا صلہ دونگی میں
کیفؔ !سچی !! فقط آپ کے واسطے
ساری دنیا کو ٹھوکر لگا دوں گی میں"
محفلِ شعر ہے بزمِ افسانہ ہے
فن کی بحثیں ہیں فنکار کی بات ہے

روشنی موجزن ہے قلم ہے رواں
اک حسیں صبح ہے اک حسیں رات ہے
خواب ٹوٹا تو کچھ بھی نہیں دور تک

اب وہ چھوٹا سا گھر ہے نہ اس کے مکیں
جانے معصوم لڑکی کہاں کھو گئی
رنگ و نکہت کی محفل بھی ویران ہے
شعر و افسانہ کی بزم بھی سو گئی

صرف میں ہوں سلگتی سی تنہائی ہے
صرف احساس ہے وہ بھی کچلا ہوا
صرف آنکھیں ہیں آنکھوں سے خوں ہے رواں
صرف دل ہے مگر وہ بھی سہما ہوا

اب بھی دل کو تمنّا ہے اک خواب کی
جس کو دیکھوں تو بس دیکھتا ہی رہوں
ورنہ آنکھوں سے نیندیں چُرا لے کوئی
اور میں عمر بھر جاگتا ہی رہوں

●

اعجاز قریشی

سنگ اور خاک

تم مجھے دیکھ کے خاموش سی ہو جاتی ہو
ہونٹ سی لیتی ہو
انجان سی بن جاتی ہو
سر جھکائے ہوئے چپ چاپ چلی جاتی ہو

اور میں سوچتا رہتا ہوں یہی
وہ تکلم جو میرے زخم سیا کرتا تھا
وہ نگاہیں جو میرے ساتھ چلا کرتی تھیں
وہ ادائیں جو میرے خواب بُنا کرتی تھیں
وہ ادائیں، وہ نگاہیں وہ تکلم ہے کہاں

گدگداتی تھی میری روح کو جو شوخ ہنسی
وہ تبسّم جو مجھے لوٹ لیا کرتا تھا
وہ ہنسی روٹھ گئی کیوں
وہ تبسّم ہے کہاں
جس پہ مرتا تھا میں جینے کی قسم کھا کھا کر

اب وہ انداز کہاں
مجھ کو لے آئی یہ گردشِ ایام کہاں
اب تو یہ حال ہے
ملتی ہو مہینوں میں کبھی
جانے کس سوچ میں کھو جاتی ہو مجھ کو پا کر
تم سے ملنے کی خوشی
ایک ہی لمحے کی خوشی
منجمد ہو کے اداسی میں بدل جاتی ہے
پھر وہی ہیں
پھر وہی یادوں کا ہجوم
ذہن ہر یاد سے سر پھوڑ کے رہ جاتا ہے

آج پھر پاس سے گذری ہو جو غیروں کی طرح
اُنگلیاں پلکوں پہ اور لب خاموش
سر کو ڈھانپے ہوئے
آنچل کا سہارا لے کر
آج پھر لٹ گیا میں ایسا نظارا پا کر
رات پُر ہول ہے ڈستا ہے اندھیرا گہرا
راستے بجھتے نظر آتے ہیں
کیوں اندھیرے میں مگر آج بڑھے جاتے ہیں

اپنے مجبور قدم

اپنے ہی قدموں کی آواز بھیانک کیوں ہے ؟
پھڑپھڑاتا ہے دھڑکتا نہیں دِل
کسی مظلوم کسی زخمی پرندے کی طرح
کس کے رونے کی سسکنے کی صدا آتی ہے
شور یہ کیسا —— یہ چیخیں یہ کراہیں کیسی
کاش ایسے میں کوئی دے آواز
جسے سننے کو
کان مدّت سے ترستے ہیں میرے
دُور سے نام میرا لے کے پکارے کوئی
اور میں مُڑکے جو دیکھوں، وہیں بُت بن جاؤں

●

نجیب رامش

تجھ سے کیا پایا ہے

تجھ سے کیا پایا ہے میں نے جو مجھے یاد ہے تو
تیرے رخسار کی گرمی نہ تیرے جسم کی دھوپ
کوئی سکھ بھی تو نہیں ہے جو دیا ہو تو نے
درد ہی دل میں نہ تھا جس کا مداوا ہوتا
اور نہ غم ہی تھا جسے بانٹ لیا ہوتا
تیرے تخئیل میں کچھ بھی تو نہیں ہے ایثار
یاد آئے جو مجھے تیری بھی یاد آ جائے
پھر بھی جب اُگتے ہوئے چاند کی چنچل سی کرن
سطح دریا کو بنا لیتی ہے اپنا درپن
جگمگا اُٹھتے ہیں شبنم سے نہائے ہوئے بن
موج ساحل کی نگاہوں سے چراتی ہے بدن
پھول کی جاگی ہوئی آنکھ جھپک جاتی ہے
بند ہو جاتا ہے بیتاب ہوا کا بہنا
بجھنے لگتے ہیں ہر اک گھر کے دریچوں میں چراغ
اچھا لگتا ہے ہر اک انسان کو جب چپ رہنا

ایسا لگتا ہے کہیں پاس ہی موجود ہے تو
جیسے پتھر میں صنم، جسم میں دل، پھول میں باس
جیسے کھوئی ہوئی آواز کی کھوئی ہوئی گونج
جیسے اجڑے ہوئے ساحل کو کسی ناؤ کی آس

●

خورشید احمد جامی

سفر کے بعد

ایک اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا تم کیا تھے
ایک جلتے ہوئے نغمے کے سوا میں کیا ہوں
خوبصورت سی نگاہوں کے چمکتے دھوکے
جسم کی آنچ گناہوں کی دھڑکتی راتیں
نرم ہونٹوں کے چرائے ہوئے سالے بوسے
مست باہوں سے نکھاری ہوئی ساری باتیں

ہائے وہ خواب جو تم سے بھی کہیں دلکش تھے
تم نے خود بیچ دئیے وقت کے بازاروں میں
وہ جوانی جو میرے پیار سے ٹکرائی تھی
بٹ گئی اور بھی کتنے ہی خریداروں میں

ایک بگڑی ہوئی عادت کے سہارے تم نے
میرے سینے میں کوئی شمع جلائی ہوگی
مجھ سے دانستہ کوئی ربط بڑھایا ہوگا
میرے پہلو میں کوئی بزم سجائی ہوگی

تم نے تقدیسِ وفا کو بھی تجارت سمجھا
میں نے اس زہر کو تریاق بنانا چاہا
تم نے ہر جھوٹ کو زرکار و حسیں ٹھہرایا
میں نے اک روحِ صداقت کو جگانا چاہا

وہ تو بس ایک مروت تھی کہ میری خاطر
دل کو آمادۂ گفتار کیا تھا تم نے
چند پاکیزہ اصولوں پہ قسم کھائی تھی
ایک خاموش سا اقرار کیا تھا تم نے

کیسے کیسے زخم تصوّر میں اُبھر آتے ہیں
سوچتا ہوں کہ یہاں کون سنبھل سکتا ہے
کس کا حالات کے شعلوں سے بچا ہے دامن
کون ماحول کے زنداں سے نکل سکتا ہے
ایک اڑتی ہوئی خوشبو کے سوا تم کیا تھے
ایک جلتے ہوئے نغمے کے سوا میں کیا ہوں

●

انور معظم

اجنبی

یہ تم کیوں اس طرح گُم سُم مری صورت کو تکتی ہو
اس آئینے میں کس کو ڈھونڈنے لگتی ہیں یہ نظریں

کسی احساسِ گم گشتہ کا رنگیں سایۂ گذراں
کسی دھندلے تصوّر کا اُبھرتا ڈوبتا پیکر
کسی بھولے ہوئے گیسو بریدہ خواب کا چہرہ
کوئی عکس نظر آرا کسی الھڑ تمنّا کا
کوئی انجام لب ناآشنا دلبر کہانی کا
کوئی ناآفریدہ گلشنِ ارماں کی پرچھائیں
اُجالا انتظار انگیز راتوں کی جوانی کا

یہ تم کیوں اس طرح گُم سُم مری صورت کو تکتی ہو
اس آئینہ میں کیا تم اپنی ہی یادیں سنوارو گی
تم اپنے ہی خیالوں اور خوابوں کا پتہ لوگی
بس اپنی ہی اُمنگوں، آرزوؤں کو صدا دوگی

اگر فرصت ملے آرائشِ زلفِ تصوّر سے
جو جی چاہے .... کبھی یہ پردۂ تاباں اُٹھا لینا
کہ اس دیوار نور افشاں کے پیچھے .... ایک عالم ہے!
یہاں بھی اِک زمیں ہے، آسماں ہے، چاند تارے ہیں
جہاں نکہت برافگندہ نقاب آوارہ پھرتی ہے
ترستی ہے کسی کے پاؤں کی زنجیر بن جائے
جہاں اک روشنی پرچھائیوں کے جال میں بےبس
تڑپتی ہے کسی کے خواب کی تعبیر بن جائے
خیالوں کے ادھورے نقش بنتے ہیں، بگڑتے ہیں
جو تم چاہو تو اِن سے اِک حسیں تصویر بن جائے
مری بکھری ہوئی تخلیق کی تقدیر بن جائے

●

راشد آذر

نقشِ تازہ

فکرِ آذر نے تراشے تھے خیالوں میں صنم
آتشِ گُل سے حسیں، موجِ تبسّم سے گداز
جو حقیقت سے جلا پا نہ سکے ٹوٹ گئے
اک ہزیمت نے عیاں کر دئے سب زیست کے راز

فکرِ فردا نے پھر اک بار سجا رکھے ہیں
میرے ماضی کے جھروکوں میں پرانے اصنام
ان کے ماتھے پہ دمکتی ہے لہو کی بندی
اُن کے چہرے پہ منقش ہے مرے شوق کا نام

خون میں ڈوبی ہوئی سرخ کرن پھوٹی ہے
میری یادوں کے دمکتے ہوئے رخساروں سے
میرے ماضی کے شبستاں میں دئے جلتے ہیں
روشنی دل میں ہوئی درد کے انگاروں سے

آج پھر دل کو تمناؤں نے بیدار کیا
آج پھر میں نے اسی شوق سے کچھ سوچا ہے
ایک اُمیدِ غمِ آگہیں کا سہارا لے کر
میں نے ہر یاد کے ماتھے سے لہو پونچھا ہے

ہر تمنّا کو کسی یاد نے چمکایا ہے
غم نے تاریک تخیّل کو ضیا بخشی ہے
کش مکش حسرت و اُمید کی آمیزش ہے
زیست کے ہاتھ کو محنت نے حنا بخشی ہے

جب کبھی زیست کے ہر رنگ کو مبہم پا کر
یاس اُمید کی تصویر مٹا دیتی ہے
آرزو یاد کی بکھری ہوئی کرنیں لے کر
پردۂ دل پہ نیا نقش بنا دیتی ہے

●

لطیف ساجد

خاکستر

مرے شباب کی تنہا طویل راتوں میں
تمہارے بعد کوئی شمع اور کیا جلتی
جس آرزو کو بہر حال بجھ کے رہنا تھا
نصیب دشمناں پھر کیوں وہ پھولتی پھلتی

نیاز عشق کو تم سے گلہ تو اب بھی نہیں
کہ حسن یوں بھی رہا ہے ازل سے سرد و خموش
مگر نگاہِ تمنّا کے خواب اے توبہ!
حیاتِ شوق ہوئی جا رہی تھی طوفانِ جوش

تھکا ہوا تھا تمہاری نظر کی شہہ پا کر
دلِ غریب ذرا یونہی مسکرایا تھا
غموں کے سرد دھندلکے تو خیر کیا مٹتے
افق پہ ایک ستارہ سا جھلملایا تھا

تمہیں تو سوزِ محبت سے واسطہ ہی نہ تھا
یہ آج چشمِ فسوں بار کیوں بھر آئی ہے
مری فسردہ نگاہی سے تم کو کیا لینا!
سزا بلند نگاہی کی میں نے پائی ہے

کریدتی ہو جو پھر ناخنِ تمنّا سے
فنا مآل اُمیدوں کی خاک میں کیا ہے
کہاں سے ہمتِ تجدیدِ شوق لاؤں گا
نظر میں عہدِ وفا اب بھی کپکپاتا ہے

گزر رہا ہوں اب اس زندگی کی منزل سے
جہاں تصوّرِ کیفِ بہار بھی ہے گناہ
بہت اُٹھائے فریبِ نشاط کے احسان

اب اور روح کو تکلیفِ مدعا تو نہ دو
بجھی ہوئی سہی شمعِ جنوں ہوا تو نہ دو

نشتر خانقاہی

زندگی کے ویرانے

کھنڈر اینٹوں کے، دیواروں کے ملبے، ڈھیر مٹی کے
وہ اک ٹوٹی حویلی اب بھی اکثر یاد آتی ہے
مہکتے آنچلوں کے درمیاں زلفوں کے جھرمٹ میں
وہ اک چنچل چھبیلی اب بھی اکثر یاد آتی ہے
محبت کیسی ہوتی ہے جوانی کیسے آتی ہے
وہ ان بوجھی پہیلی اب بھی اکثر یاد آتی ہے

کھنڈر کی گود میں پہلے پہل جب چاند اُترا تھا
ستارے دل میں کانپے تھے لہو میں آگ بھڑکی تھی
مجھے پہلے پہل دھوکا دیا تھا آرزوؤں نے
میری چھاتی کسی کے غم سے پہلی بار دھڑکی تھی
مجھے اب یاد بھی آتا نہیں وہ کون تھی کیا تھی
وہ اک معصوم دیوی تھی وہ اک نادان لڑکی تھی
مہکتے آنچلوں کے درمیاں زلفوں کے جھرمٹ میں
میں اب ہنستے ہوئے زخموں میں ٹانکے بھرنے لگتا ہوں

کبھی رخسار کے شعلوں کو لب میرے ترستے تھے
کبھی رخسار کی پرچھائیوں سے ڈرنے لگتا ہوں
تقاضے زندگی کے جب مجھے مجبور کرتے ہیں
میں جھوٹے دل سے پھر جھوٹی محبت کرنے لگتا ہوں

زمانے نے مجھے مہلت نہ دی میں کیا سمجھ سکتا
کہ تاریکی میں شمع کامرانی کیسے آتی ہے
سڑک پر گھومتی پرچھائیاں مجھ سے یہ کہتی ہیں
کھنڈر میں چل کہ روح زندگانی کیسے آتی ہے
میرے دل پر مگر یہ راز کھلنے ہی نہیں پاتا
محبت کیسے ہوتی ہے جوانی کیسے آتی ہے

●

سلیم الرحمٰن

انجام

دل کو دھڑکا نئی ہوئی سب آہٹیں چپ ہو گئیں
سانس کی سرگوشیاں میٹھی ہوائیں کھو گئیں
خواہشوں کی دلہنیں کروٹ بدل کر سو گئیں

دُور کیسے ہو گئے اب ہاتھ وہ خوشبو بھرے
وہ چمکتے راستے، گلیاں، نگر جادو بھرے
رہ گئے جھونکے ہوا کے دکھ بھرے آنسو بھرے

شام جب آئے کسی ویران گوشے میں چلو
آنکھ سے مالا پرو، سانس ٹھنڈے سے بھرو
چپکے چپکے اپنے دکھ کی آگ میں بیٹھے جلو

اب کوئی چاہت بھرے گیتوں کا متوالا نہیں
اس اندھیرے میں صدا کا کوئی اجیالا نہیں
کوئی پل بیتی ہوئی باتوں کی خوشبوئیں لئے
سونے کمرے کی فضا میں لوٹنے والا نہیں

محمد علوی

ایک منظر

اسی پیڑ کی چھاؤں میں
دوپہر کو
اسے میں نے دیکھا تھا
وہ اپنی بکری کے بچّے کو
باہوں میں لے کر
اسے پیار سے چومتی تھی
مجھے دیکھ کر
اس نے مجھ سے کہا تھا
"میرے گھر میں سب سو رہے ہیں
مجھے نیند آتی نہیں
اس لئے میں یہاں آگئی ہوں
مگر تم؟
نہیں کیا ہوا؟
کس لئے تم بھلا
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں
پھر رہے ہو؟"

تو میں نے اسے
یاد آتا نہیں کیا کہا تھا
جسے سن کے وہ ہنس پڑی تھی
اسی پیڑ کی آڑ میں
دوپہر جب کھڑی تھی
بہت سال پہلے کی یہ بات ہے پر
ابھی تک
میری آنکھوں میں
قید ہے
سارا منظر

●

رفعت سروش

ترا خیال

ترا خیال ترے رخ کی چاندنی کی طرح
مرے دماغ کے گوشوں کو جگمگاتا ہے
ترا خیال صفیرِ بہار کی صورت
خزاں رسیدہ گلستاں میں چہچہاتا ہے
ترا خیال صبا کا لطیف جھونکا ہے
روش روش پہ جو غنچے نئے کھلاتا ہے
ترا خیال تبسّم کی اِک کرن بن کر
شعورِ حسن کے غنچے نئے کھلاتا ہے
ترا خیال ہے وہ ہم سفر مرے دل کا
جو ہر قدم پہ نئی مشعلیں جلاتا ہے
ترا خیال ترے نازِ بے رخی کی طرح
کبھی کبھی مجھے دیوانہ بھی بناتا ہے
ترا خیال ترے پیار کی امانت ہے
ترا خیال مری شاعری کی زینت ہے

●

منیر نیازی

برسات

آہ! یہ بارانی رات
مینہ، ہوا، طوفان، رقص صاعقات
شش جہت پر تیرگی اُمڈی ہوئی
ایک سناٹے میں بزم حادثات
اور میری کھڑکی کے نیچے
کانپتے پیڑوں کے پات
چار سو آوارہ ہیں
بھولے بسرے واقعیات!
جھکڑوں کے شور میں
جانے کتنی دُور سے
سن رہا ہوں تیری بات!

امیر عارفی

دستک

کمرے میں اپنے لیٹا تھا یہ سوچتے ہوئے
کتنی حسین چاندنی راتیں گذر گئیں
نکلا جو چاند رات میں دل ڈوبنے لگا
یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ سی اک ہوئی
سمجھا کوئی کواڑ پہ دستک سی دے گیا
اُٹھا !
بڑھا !
کواڑ کو کھولا !
کوئی نہ تھا !
حیران ہو کے لوٹا تو محسوس یہ ہوا
دستک جو تھی وہ دل کے دھڑکنے کی تھی صدا

آؤ

بے ادب ستاروں نے
نیند میں مخل ہو کر
تم سے کچھ کہا ہوگا
لیکن ان کی باتوں کا
تم یقین مت کرنا
آؤ آ کے خود دیکھو
مضطرب کہاں ہوں میں

مخمور سعیدی

زادِ سفر

اجنبی چہروں کے پھیلے ہوئے جنگل میں
دوڑتے بھاگتے لمحوں کے دریچے سے کبھی
اتفاقاً تیری مانوس شباہت کی جھلک
پردۂ چشم تخیّل پہ ابھر کر اے دوست
ڈوب جاتی ہے اسی پل اسی ساعت جیسے
تیز رو ریل کی کھڑکی سے ذرا دوری پر
کسی صحرا کی جھلستی ہوئی ویرانی میں
ناگہاں منظرِ رنگیں کوئی دم بھر کے لئے
اِک مسافر کو نظر آئے اور اوجھل ہو جائے

●

قمر جمیل

دُعا

یہ دُعا ہے کوئی گلہ نہیں —
میرے ہمنشیں میری زندگی
وہ گلاب ہے جو کھلا نہیں
میں یہ سوچتا ہوں خدا کرے
تجھے زندگی میں وہ سکھ ملے
جو کبھی مجھے بھی ملا نہیں

شبنم رومانی

حسینوں کے خطوط

یہ ورق ہیں کہ دھڑکتے ہوئے دل بکھرے ہیں
نرم ہاتھوں کی یہ شرمائی ہوئی تحریریں
گرم سانسوں کے یہ گھبرائے ہوئے افسانے
ایک رانجھے کے تعاقب میں ہزاروں ہیریں
یہ میری میز پہ بکھرے ہوئے رنگین خطوط!

ہائے یہ نذرِ عقیدت یہ کسی زُلف کی لٹ
چوڑیوں کے یہ ہرے، لال سنہرے ٹکڑے
یہ حسیں خون سے لکھا ہوا پیمانِ وفا
"ہم نہیں بدلیں گے چاہے کوئی کردے ٹکڑے!"
یہ میری میز پہ بکھرے ہوئے رنگین خطوط!

شوخ لفظوں کے دھوئیں میں یہ ابھرتے ہوئے نقش
یہ بریلی کی دھنک شاہجہاں کے چاند
یہ شبِ نازِ اودھ، یہ سحرِ کوثر گنج
اتر آئے ہیں دریچے میں بڑی دور کے چاند
یہ میری میز پہ بکھرے ہوئے رنگین خطوط!

یہ کراچی کے طرح دار حسینوں کے پتے
یہ میرے شہرِ دل افروز کا بھرپور شباب
یہ کسی قصر کے سینے کی سلگتی ہوئی آگ
یہ کسی لاج کی آنکھوں کے مہکتے ہوئے خواب
یہ میری میز پہ بکھرے ہوئے رنگین خطوط!

کاش میں شاعرِ رومان نہ ہوتا شبنمؔ
ورقِ شوق پہ لفظوں کی طرح سو جاتا
کاش، جن پھول سے ہاتھوں نے یہ خط لکھے ہیں
میں انہیں ہاتھوں کا لکھا ہوا خط ہو جاتا!

●

مصطفیٰ زیدی

دُور کی آواز

میرے محبوب دیس کی گلیو
تم کو اور اپنے دوستوں کو سلام
اپنے زخمی شباب کو تسلیم
اپنے بچپن کے قہقہوں کو سلام

عمر بھر کے لئے تمہارے پاس
رہ گئی ہے شگفتگی میری
آخری رات کے اداس دِیو
یاد ہے تم کو بے بسی میری؟

یاد ہے تم کو جب بھلائے تھے
عمر بھر کے کئے ہوئے وعدے
رسم و مذہب کی اس پجارن نے
ایک چاندی کے دیوتا کے لئے

جانے اس کارگاہِ ہستی میں
بس کو وہ دیوتا ملا کہ نہیں
میری کلیوں کا خون پی کر بھی
اس کا اپنا کنول کِھلا کہ نہیں

آج کل اس کے اپنے دامن میں
پیار کے گیت ہیں کہ پیسے ہیں
تم کو معلوم ہو تو بتلانا
اس کے کپڑوں کے رنگ کیسے ہیں

مجھ کو آواز دو کہ صبح کی اوس
کیا مجھے اب بھی یاد کرتی ہے
میرے گھر کی اُداس چوکھٹ پر
کیا کبھی چاندنی اُترتی ہے؟